

نبوت کی ضرورت

عبد الحمید صدیقی

(۲)

ایک نبی کی اصلاحی کوششیں مقصوف کے گیان و بصیرت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اور ان کا دائرہ کار بھی مقصوف کے دائرہ کار سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ مقصوف کی جدوجہد کا کعبہ مقصود یہی ہے کہ وہ ریاضت کے ذریعہ ایک قسم کے روحانی سرور سے لطف اندوز ہوتا رہے اور جو لوگ اُس کے زیر اثر آئیں یا اپنے آپ کو اُس سے وابستہ کریں وہ انہیں بھی اسی کیفیت و مستی سے لذت آشنا کرے۔ اس کے مقابلے میں نبی کا کام بڑا وسیع اور صبر آزماتا ہوتا ہے۔ فکر و نظر کے زاویوں سے لیکر عملی زندگی کی معمولی سے معمولی جزئیات تک نبی اپنی پوری توجہ صرف کرتا ہے اور ان میں اس انداز سے تغیرات لاتا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے تعصبات الہی کے سانچوں میں ڈھل جائیں۔ حیات انسانی کا کوئی گوشہ اور قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں ہوتا جہاں اُن تعصبات کے اثرات نمایاں نہ ہونے پائیں۔ نبی ایک طرف بنی نوع انسان کو اس کائنات، اس کے خالق اور خود اپنی ذات کے بارے میں ایک صحیح نقطہ نظر عطا کرتا ہے۔ پھر ان کے باہمی تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار کر کے اس کے فکری اور عملی مضمرات ذہن نشین کراتا ہے۔ اس کے بعد وہ تعمیر سیرت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ دل و دماغ کے جس جس گوشہ میں باطل احساسات اور گمراہ کن تصورات کی جھاڑ بھنکار موجود ہو، اُس سے نفس انسانی کو پاک اور صاف کرتا ہے اور پھر اُس میں ایمان و یقین کے بیج بوتا ہے اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے ان کی آبیاری کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسی طرح دیکھتے دیکھتے سیرت و کردار کی لبہائیں کھیتیاں تیار ہو جاتی ہیں۔

انفرادی اصلاح سے آگے بڑھ کر انبیاء علیہم السلام معاشرتی، سیاسی اور معاشی میدانوں

میں بھی ایک صلح انقلاب کے علمبردار ہوتے ہیں۔ وہ سوسائٹی سے ہر قسم کی جاہلانہ رسوم کا قلع قمع کرتے ہیں۔ انسانوں کو انسان کی بندگی سے نکال کر انہیں خدا کی بندگی اختیار کرنے کی نہ صرف تلقین کرتے ہیں بلکہ ایک ایسی اجتماعی زندگی کی داغ بیل بھی ڈالتے ہیں جس میں انسان کی بندگی کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ معاشرہ میں اوپر نیچ کے جو غلط امتیازات قائم ہوتے ہیں، انہیں ایک ایک لمحے مٹاتے ہیں اور انسان کی معاشی زندگی کو ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ سے بچا کر عدل و انصاف کے اصولوں پر استوار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نوع انسانی کو صلح و جنگ کے نئے آئین اور نئے ضابطوں سے آشنا کرتے ہیں۔ الغرض حیات انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہوتا جہاں ان کی تعلیمات کے گہرے اثرات مترتب نہ ہوں۔ وہ نوع انسانی کو ایسی زندگی بخش اقدار عطا کرتے ہیں جنہیں دیکھ کر ایک شخص فوراً اس بات کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ سب تعلیمات ربانی ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور ان کے کارناموں کو ہم خارجی دنیا میں نہ صرف واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں بلکہ عقل سلیم کی میزان پر تول کر ان کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن متصوفین کے جس گروہ کا ہم نے ذکر کیا ہے ان کے کاموں کی عقل و خرد ممکن ہے کوئی دوز کار تعبیر کر کے ان کے لیے کوئی فلسفیانہ بنیاد فراہم کر سکے، مگر آج تک عقل کوئی ایسا پیمانہ ایجاد نہیں کر سکا جس سے ان کی صحیح پیمائش ممکن ہو۔ متصوفین کا دائرہ عمل چونکہ داخلی زندگی تک محدود ہے اور ان کی تنگ و تناز کا مقصد کیفیت و مستی کے حصول کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اس لیے عقل اس کے باسے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتی۔ یہ کیفیت و مستی متصوفین کی نظر میں زندگی کے ان سرسبز اسرار میں سے ہے جن کی تحلیل و شواہد ہے اور جن کی نزاکت اور لطافت علمی موثر گافیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی، یا توئی کہیے کہ خشک علیت ان کی عقدہ کشائی کی صلاحیت اور اہمیت نہیں رکھتی۔ اسی بنا پر اہل خرد کو اہل جنوں کا یہ طعنہ قدم قدم پر سننا پڑتا ہے

لے یہ امر ملحوظ خاطر ہے کہ متصوفین سے مراد وہ مسلمان صوفیاء کلام نہیں جنہوں نے اسلامی تعلیمات کا پرچار

از بے خبری، بے خبری اور معذرت

ذوقیت دیریں بادہ کہ مستان دانند

تصوف سرسرا ایک داخلی کیفیت کا نام ہے، اس لیے اسے کسی معروضی معیار پر پکڑ کر اس کے صحیح اور غلط ہونے کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس کے مقابلے میں انبیاء علیہم السلام نے نوع انسانی کو جو تعلیم دی ہے وہ اگر ایک طرف اُس کے فکر میں سلجھا دیا اور اس کے قلب میں طمانیت پیدا کرتی ہے تو دوسری طرف ایک ایسی تہذیب کا سنگ بنیاد بھی رکھتی ہے جو انسان کی اجتماعی زندگی کو بہتر قسم کی کشاکش سے پاک کر کے اُسے پرسکون بناتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تصوف کے اندر کسی تمدن کی تشکیل کی قطعاً کوئی صلاحیت سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی تاہم اس کے اوراق اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ خالص روحانیت نے آج تک کسی محدود سے محدود رقبہ زمین میں کسی تمدنی زندگی کو جنم نہیں دیا۔

انبیاء علیہم السلام اور متصوفین کی تعلیمات کے درمیان تمیز و فرق یہ ہے کہ انبیاء کی تعلیمات میں ایک یقین اور وثوق ہوتا ہے وہ انسانیت کو ایمان و ایقان کی دولت سے سرفراز کرتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں متصوفین سے جو چیز انسان کو حاصل ہوتی ہے اُس کی حیثیت ایک وقتی تاثر یا قلبی کیفیت کی ہے، اُس میں وہ یقین مفقود ہوتا ہے جسے تعلیمات نبوی کی جان کہا جاسکتا ہے۔ اس امتیاز کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ تصوف کا تعلق جس حاسہ سے ہے وہ بھل ایک انسانی حاسہ ہی ہے، اسی طرح کمزور، محدود اور خطا پذیر جس طرح کہ انسان کے دوسرے حواس ہیں۔ اس لیے اس کے دائرہ عمل میں غلطی کا صدور ہر وقت ممکن ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو متصوفین کے مشاہدات میں بھی اسی طرح ہم آہنگی ہوتی جو ہمیں انبیاء کی تعلیمات میں ملتی ہے۔ کیا اور جن کی اپنی زندگیاں اسلام کا نہایت ارفع و اعلیٰ نمونہ تھیں یہاں متصوفین کے جس گروہ نے بحث کی جارہی ہے وہ ان اصحاب پر مشتمل ہے جو صرف گیان و حیان کو زندگی کا کمال سمجھتے ہیں اور زندگی اور اس کے عملی مسائل سے یکسر لاپرواہ ہو کر زندگی گزارنے کے عادی ہیں۔

نظر آتی ہے۔ مشہور عارف ربانی حضرت مجدد الف ثانی علیہ السلام نے اپنے مکتوبات میں اس امر کی مختلف طریقوں سے تصریح فرمائی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ مشاہدہ باطن صفائی نفس اور ایک ایسے اندرونی حاسہ کو بیدار کر دینے سے ممکن ہے، جو روحانیت اور ماوراء الطبیعیات کا اسی طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری آنکھیں ظاہری چیزوں کا ادراک کرتی ہیں یہ اندرونی روشنی ریاضت، نفس کشی اور مراقبہ اور تفکر سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس مشاہدہ باطن سے جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ اس طرح کا یقینی علم نہیں جو نبوت کی بارگاہ سے ملتا ہے۔ اس میں وہ ساری خامیاں پائی جاتی ہیں جو علوم عقلی میں موجود ہیں۔ کیونکہ کشف یا مشاہدہ باطن کی بنیاد بھی ایک انسانی حاسہ ہی ہے جس کی کچھ حدود ہیں اور جس میں نفس انسانی کی کمزوریاں بالضرور شامل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

”اب ہم اصل بات کو بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بعض اوقات مشاہدہ باطن میں بھی خطا ہو جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ صاحب کشف بعض قلبی واردات کو الہامی کیفیات سمجھ لیتا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں بعض اوقات یہ دونوں کیفیات باہم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گڈمڈ ہو جاتی ہیں کہ صاحب کشف ان کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا اور وہ غلطی سے ان ساری واردات کو الہامی خیال کر لیتا ہے پس یہ بات ذہن نشین رہے کہ کشف و مراقبہ کے بعض اجزاء میں خطا ہونے کے باعث پورے علم میں ہی خطا کا احتمال باقی رہتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحب کشف جو کچھ دیکھتا ہے اس کی ظاہری شکل و صورت کو آخری اور قطعی سمجھ لیتا ہے حالانکہ یہ مکاشفہ اپنے فراج کے اعتبار سے تاویل و تعبیر کا محتاج ہوتا ہے۔“

دکنو بانشہ امام ربانی دفتر اول کتب ۱۲۱۷

متصرفین کے مقابلے میں جو تعلیم نوع انسانی کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ ملتی ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل و اکمل، اور ہر خطا سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ اس سے انسان کو یقین

اور ایمان کی دولت ہاتھ آتی ہے اور وہ اس کائنات، اس کے خالق و مالک، خود اپنے مرتبہ و مقام کے متعلق یقینی علم حاصل کرتا ہے۔ یہ تعلیم اُس سے رب و تشکک کی بھول بھلیوں سے نکال کر اُس کے راستے کو عزم و یقین کی روشنی سے منور کرتی ہے۔ مجدد و اہل ثانی نے ان دونوں قسم کی تعلیمات کی نوعیت میں جو اساسی فرق ہے اُس کی علت بھی بتائی ہے۔ اسی موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

« فرشتہ چونکہ خطا و گنہگار سے پاک اور ان کو دیروں سے متراہنوتا ہے جن کی وجہ سے ایک انسان غلطی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس بنا پر وہ یقیناً اعتماد کے لائق ہے اور اس کے پیش کردہ احکام و مہم و خیال کی دستبرد سے محفوظ و مامون ہوتے ہیں... اس بنا پر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی ہدایت و رہنمائی کے بغیر انسان تزکیہ نفس کی حقیقت کو نہیں پاسکتا۔ اور وہ صفائی جو کافروں اور فاسقوں کو حاصل ہوتی ہے وہ نفس کی صفائی ہے نہ کہ قلب کی صفائی۔ وہ مراقبہ یا ریاضت جس کی بنیاد تعلیمات نبوی نہ ہو، اُس سے گراہی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور خسران کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آتا اور بعض ماوراء الطبیعیات چیزوں کا کشف جو گیان و دھیان کے وقت کافروں اور فاسقوں کو حاصل ہوتا ہے وہ استدراج ہے جس سے مقصود ان لوگوں کی خرابی اور خسران ہے۔

(دفتر اول مکتوب ۲۶۶)

ایک دوسرے مقام پر وہ اسی حقیقت کو بڑے زور و ارافاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

« الغرض وہ چیزیں جن پر قطعیت کے ساتھ اعتماد کیا جاسکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی ہیں جن کا مشرک من اللہ ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ رشد و ہدایت کی یہ تعلیم خدا فرشتے کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام پر نازل کرتا ہے اس بنا پر وہ ہر قسم کی خطا اور غلطی سے پاک ہوتی ہے۔

علماء کا اجماع اور مجتہدین کا اجتہاد بھی انہیں دو اصولوں کی طرف راجح ہے۔ ان چار شرعی اصولوں کے سوا اور جو کچھ بھی ہو خواہ وہ صوفیاء کے علوم و معارف ہوں یا ان کے مکاشفے اور مراقبے۔ اگر یہ چیزیں مندرجہ بالا چاروں اصولوں کے مطابق ہوں تو وہ قابل قبول ہیں ورنہ مردود۔ وجد و حال کو جب تک شرع کی میزان پر نہ تول لیا جائے، وہ ایک حید سے بھی کم اہمیت کا حامل ہے اور کشف و مراقبہ کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں اس کی حیثیت مسِ خام سے بھی کم ہے۔

مشاہدہ و مراقبہ بذاتِ خود مطلوب و مقصود نہیں بلکہ بعض لوگ ان کی مدد سے تعلیماتِ الہی کے بارے میں شرح صدر حاصل کرتے ہیں۔ رویتِ الہی کا وعدہ صرف آخرت کے لیے ہے اور جو اس کی دنیا میں عام انسانوں کے لیے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ باقی رہیں وہ تجلیات یا وہ مشاہدے جن پر صوفیاء کرام نازاں ہیں وہ درحقیقت ظلال یا شبہ و مثال ہیں۔ حق تعالیٰ وراء الوراہ ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ اگر ان مشاہدات اور تجلیات کی حقیقت پر سے نقاب کشائی کر دوں تو اس راہ کے مسافر کا ذوقِ غلب کم ہوگا اور ان کے جذبہ شوق پر فزونی طاری ہو جائے گی لیکن دوسری طرف مجھے اس بات کا بھی خطرہ لاحق ہے کہ حقیقت کو جاننے کے باوجود اگر میں خاموش رہوں تو حق باطل سے تمیز نہ ہوگا۔۔۔۔ حضور سرورِ دو عالم کو اس دنیا میں دیدارِ الہی نصیب ہوا اور وہ اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ کے کامل تابعین میں سے جس کو بھی مشاہدہ باطن حاصل ہو اس کی نوعیت دوسری ہوگی۔ وہ خدا کے نور کا پرتو تو ہوگا لیکن وہ رویتِ ظلال میں سے کسی ظل کے پردے میں ہوگی۔ صاحبِ کشف اس حقیقت کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ جب موری کلیم اللہ جیسے جلیل القدر نبی دیدارِ الہی کی تاب نہ لائے اور وہ یہوش ہو کر گر گئے تو پھر

عام انسان میں یہ قوت و طاقت کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ باری تعالیٰ کی تجلی
کی تاب لاسکیں؟
(ذکر اول مکتوب ۲۱۷)

دنیا سے اسلام کے مشہور مفکر سید رشید رضا مصری نے اپنی فاضلانہ تصنیف
”الوحی المحمدی“ میں وحی کی تعریف کرتے ہوئے اس حقیقت کی بڑے واضح الفاظ میں نشاندہی
کی ہے کہ یقین، ذوق، قطعیت و حتمیت وحی الہی کی ضروری صفات ہیں۔ جو علم خالق کائنات
اور غیب و شہود کے متعلق ذوق بشری کو یقینی اور قابل اعتماد معلومات فراہم کرتا ہے وہ یہی
وحی والہام کے ذریعہ سب سے حاصل ہوتا ہے۔ معلومات کا یہی ایک ایسا سرچشمہ ہے جسے
انسانی خواہشات و توہمات، اور انسانی عقل و فکر اور اس کا مشاہدہ اور تجربہ اپنی فطری
کمزوریوں کی وجہ سے گدلا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک ایسا علم ہے جسے خطا و نسیان سے بالکل
محفوظ و مامون رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتا بلکہ خداوند
تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا مظہر ہوتا ہے۔ سید رشید رضا موعوم و مخفور وحی کی تعریف کرتے
ہوئے فرماتے ہیں:

”وحی وہ علم ہے جو کسی شخص کو پورے یقین اور ذوق کے ساتھ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے بالواسطہ یا بلاواسطہ حاصل ہوتا ہو۔“

الوحی المحمدی کے فاضل مصنف نے اسی فصل میں اس باطل خیال کی بھی تردید کر دی
ہے کہ انسان کی اپنی آرزوئیں و تمناؤں اور اس کے اپنے احساسات و افکار بسا اوقات الفاظ
کے نایاب سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں اور سطح میں آنکھیں انہیں وحی والہام سے تعبیر کرنے
لگتی ہیں۔ اس قسم کے نظریات رکھنے والے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وحی بھی شاعری اور
تصوف کی قسم کی کوئی چیز ہے جو انسان کی اپنی ذاتی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا مظہر ہوتی ہے
اور لوگ ان کی غیر معمولی برتری کی وجہ سے انہیں خدا کا کلام سمجھ بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ رشید رضا
صاحب فرماتے ہیں:

”جو لوگ عالم غیب کے وجود کو نہیں مانتے یا محسوسات کی دنیا سے اس کے باہمی تعلق کے منکر ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ حضور مہرورد و عالم کی اپنی معلومات ان کے ذاتی افکار اور ان کی اپنی ہی تئناؤں اور آرزوؤں نے ان کے اندر ایک الہامی قوت پیدا کر دی تھی جو ان کی بصیرت اور عقل و فکر کی باطنی قوتوں سے غذا حاصل کرتی، یا آپ کی پرشیدہ اور ملیند و بالا روحانی طاقتوں کا عکس آپ کی اعلیٰ و ارفع قوت متخیلہ پر پڑتا اور اس طرح آپ کے ذاتی اعتقادات و نظریات ہی آپ کی آنکھوں پر منعکس ہوتے مگر آپ یہ سمجھ لیتے کہ کوئی فرشتہ سامنے کھڑا ہے یا کانوں میں اُس کی آواز سنتے اور یہ (خیالی فرشتہ) جو کچھ کہتا اُسے قلب و دماغ میں محفوظ کر لیتے“

”ہم اے اور ان لوگوں کے درمیان بناٹے اختلاف یہی ہے کہ ہم شرعی وحی کو حضور کے اپنے افکار و احساسات کا نتیجہ نہیں سمجھتے بلکہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ آسمان سے حضور پر اتاری گئی تھی اور اس وجہ سے وہ حضور کے نفس سے کوئی خارج چیز ہے۔ وہ حضور کی داخلی اور باطنی قوتوں کا ظہر نہیں بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے حضور کے قلب پر فرشتہ کے ذریعہ نازل فرمایا تھا جس طرح کہ قرآن مجید میں لکھا ہے (۱۹۲:۲۶) وَاَنزَلْنَا لَكَ رَبِّكَ العالمین (۱۹۳) نزل به الروح الامین (۱۹۴) علی قلبک لتکون منہ المندبین (۱۹۵) بلسان عربی مبین“

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس طرح وحی نازل ہو ناشر شروع ہوئی، اس کا جو ذکر قرآن مجید اور احادیث میں ملتا ہے اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ علم کوئی اکتسابی نہ تھا جو آپ کی عقلی و فکری قوتوں اور مشاہدہ باطن کے ذریعہ آپ کو حاصل ہوا بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے آپ کو خود عطا فرمایا تھا۔ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

سے دریافت کیا۔ "اے رسول خدا! آپ پر وحی کیسے آتی ہے۔ رسول اکرم نے ارشاد فرمایا: کبھی یہ آواز جس کی طرح سنائی دیتی اور یہ میرے لیے سب سے زیادہ سخت ہوتی ہے، جب فرشتہ جدا ہو جاتا ہے تو میں اس کی بات پر وحی طرح محفوظ کر چکا ہوتا ہوں کبھی فرشتہ انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوتا۔ وہ مجھ سے ہمکلام ہوتا اور میں اس کی باتوں کو اچھی طرح یاد کر لیتا ہوں۔" حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے سخت جہاز سے میں آپ پر وحی نازل ہوتے دیکھی ہے وہ جب ختم ہوتی تھی تو حضور کی پیشانی سے پسینہ بہتا تھا۔

اسی طرح ایک دوسری حدیث جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے وحی کی ابتدا یوں بیان کی گئی ہے کہ حضور منیند کی حالت میں سچے خواب دیکھتے تھے۔ جو خواب بھی آپ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صبح ہوتے۔ پھر آپ کو تنہائی اور گوشہ نشینی پر خوب ہر گئی چنانچہ آپ غار میں تنہا اپنے اہل و عیال سے الگ لٹھک گئی دن اور کئی راتیں عبادت میں صرف کرتے۔ آپ اپنا کھانا خود ساتھ لے جاتے تھے جب وہ ختم ہو جانا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لاکر دوبارہ کھانا لے جاتے یہاں تک کہ غار میں حتی آپ پر ظاہر ہو گیا یعنی ایک فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا: پڑھیے، میں نے کہا: میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس نے پکڑ کر مجھے اس قدر زور سے بھینچا کہ میرا جسم ٹوٹنے لگا اور پھر کہا پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس پر اس نے دوبارہ پکڑ کر مجھے زور سے بھینچا یہاں تک کہ میرا جسم ٹوٹنے لگا۔ پھر کہا: پڑھیے، میں نے کہا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ پھر تیسری بار اس نے مجھے زور سے بھینچا اور پھر مجھے الگ کر کے کہنے لگا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ آپ اس واقعہ کے بعد دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ حضرت خدیجہ کے پاس تشریف لائے اور فرمایا "مجھے کبیل اڑھاؤ" آپ کہ کبیل اڑھا دیا گیا۔ جب آپ کی دہشت دور ہوئی تو آپ نے حضرت خدیجہ کو سارے واقعہ سے آگاہ فرمایا اور کہا

کہ مجھے اپنے بارے میں خوف لاحق ہو گیا ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، بے کسوں کی دستگیری کرتے ہیں، تہی دستوں کی مدد فرماتے ہیں، مہمانوں کی خبر گیری کرتے اور لوگوں کی مصیبتوں میں ان کے کام آتے ہیں۔ اسی واقعہ کے تین سال بعد تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ اور پھر اس کا آغاز ہوا جیسا کہ ابن عبد اللہ انصاری نے سلسلہ وحی منقطع ہوجانے کے واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک دفعہ میں جا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک آواز سنائی دی۔ میں نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہی فرشتہ جو غار حرا میں میرے پاس آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں اس سے خوفزدہ ہو گیا اور گھر لوٹ کر میں نے کہا ”مجھے کبل اڑھاؤ۔ اسی وقت خداوند تعالیٰ نے یہ وحی نازل فرمائی یا ایہا المدثر... تا آخر والرحزنا ہجر۔

وحی کی ان مختلف کیفیات کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ حضور سرورِ دو عالم پر وحی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا تھا وہ ان کی اپنی قلبی واردات یا ذہنی کیفیات کا پرتو نہ تھا۔ وحی کے آغاز کی جو احادیث امام بخاری، امام مسلم اور دیگر محدثین نے روایت کی ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور کے سامنے جب پہلی بار فرشتہ نمودار ہوا تو حضور خوفزدہ ہو گئے۔ اگر نبوت ان کی باطنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ہی عکس ہوتی تو انہیں متحیر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ اس صورت میں فرشتہ کا وجود کوئی حیران و ششدر کرنے والی چیز نہ ہوتی بلکہ ان کے نشا اور مرضی کے عین مطابق ہوتی۔ اس حالت میں وہ فرشتہ سے خوفزدہ ہونے کی بجائے اپنی طبیعت کو اس سے بالکل مانوس پاتے۔ فرشتے کے پہلی بار سامنے آنے پر ان کا خوف و ہراس اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ حضور اپنی باطنی قوتوں اور صلاحیتوں کو اس غیر معمولی منہ بخاری۔ باب ید الوحی لیسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اور بلند و بالا مقام کے حصول کے لیے شعوری طور پر تیار نہ کر رہے تھے۔ اس لیے جب فرشتہ حضور کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضر ہوا تو آپ نے اُسے ایک غیر متوقع اور اجنبی چیز سمجھ کر اُس سے خوف محسوس کیا۔

کسی صحیح اور مرفوع حدیث میں یہ تحریر نہیں کہ آپ نبوت کے متوقع اور منتظر تھے، اگر اس قسم کی کوئی روایت ہوتی تو محدثین کرام اُسے ضرور نقل کرتے۔ قرآن مجید اور احادیث کے مطالعہ سے اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے کہ حضور کو اس نعمت سے اچانک، بالکل غیر متوقع طور پر سرفراز فرمایا گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس امر کی تصریح کر دی گئی ہے۔

وما کنتم ترجوان یلقی الیک
الکتاب الارحمة من ربک ^{۷۱} (۲۸۶: ۲۸۷)

تمہیں اس امر کی امید نہ تھی کہ تم پر کتاب نازل
کی جائے گی مگر یہ سب تمہارے پروردگار کی
رحمت کی وجہ سے ہوا۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر جو کتاب نازل فرمائی ہے اور تمہیں نبوت جیسے ارفع و اعلیٰ منصب سے سرفراز فرمایا ہے اس میں تمہارے اپنے علم و عمل کا کوئی دخل نہیں ہے تمہیں اس کی توقع تھی اور نہ ہی آرزو۔ یہ جو کچھ اعزاز تمہیں بخشا گیا وہ خالق کائنات کی رحمت کا کرشمہ ہے۔

علامہ رشید رضا مصری نے اس ضمن میں ایک نہایت ہی معنی خیز بات کہی ہے وہ فرماتے ہیں اگر نبوت حضور کے ذمبی اضطراب، داخلی ہجیمان اور سوزش قلبی کا ہی نتیجہ ہوتی اور اسی وجہ سے آپ غار حرا میں دنیا سے الگ تھلگ رہ کر عبادت میں مصروف ہوئے، تو ان داخلی کیفیات کے نتیجے میں ان کا ذہن رسا اور مضطرب دل کوئی زبردست سمدہ یا کوئی فصیح و بلیغ آیات تصنیف کرتا۔ اگر مستشرقین کی یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ریگنڈ اول کی کھلی فضا نے آپ کے اندر وحدانیت کا احساس بیدار کیا اور آپ کی طبیعت کو کفر و شرک سے نفرت پیدا ہوئی، ستاروں کی خاموش فضاؤں نے آپ کے دل کے اندر

ایک طاقتور خالق کا خیال بٹھایا یا ظالم طبقوں کی ریشہ و دانیوں دیکھ کر آپ کے حساس دل کے اندر ارتعاش ہوا اور آپ نے ان پیسے ہوتے لوگوں کی دستگیری کا غم کیا۔ اگر حضور سرورِ دو عالم پر وحی کا نزول آپ کے ان احساسات کا ہی کرشمہ تھا تو پھر سب سے پہلے وہ سورتیں نازل ہوتیں جن میں ایمان و ایقان کے اصول و مبادی، توحید کا اثبات، شرک اور بت پرستی کی زبردست مذمت، پادریوں اور راہبوں کی من گھڑت شریعت، خداوند تعالیٰ کو بٹھایا پکڑنے کا ذکر اور کفر و طغیان میں سرشار سرداروں کی دنیا اور آخرت میں تذلیل اور رسوائی کے تذکرے ہوتے جیسا کہ مفصل سورتوں بالخصوص ق و القرآن المجید والذاریات، الطور، النجم، القمر، الحاقة النبأ میں ہیں۔

دگر برخلاف اس کے ہوا یہ کہ آغاز وحی کے تین سال بعد تک نہ تو حضور نے لوگوں کو کوئی سورۃ سنائی، اور نہ ہی کوئی دعوت دی اور نہ ہی اس دینی تحریک کا اپنے خاندان اور رفقاء سے کوئی تذکرہ کیا جس کا کہ بقول ان کے آپ کے دل میں خیال سمایا ہوا تھا۔ آپ نے اس دوران میں شرک کی ان عرواٹ کی بھی مذمت نہ کی جس نے آپ کے دل کو مضطرب اور پریشان کر رکھا تھا۔ اگر آپ اس قسم کی کوئی بات بیان فرماتے تو اسے بالضرور روایت کر دیا جاتا۔ اگر دوسرے لوگ یہ خدمت انجام نہ دیتے تو وہ مقدس لوگ تو اس کام کو بالضرور کرتے جو آپ سے گہرے طور پر وابستہ تھے مثلاً اہل خانہ میں سے حضرت خدیجہ، حضرت علی و زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم، اور گھر سے باہر حضرت ابو بکر صدیق جو عمر بھر آپ کے دوسرے رفیق اور فدائی رہے وحی کے اتوار کے زمانے میں ان مقدس حضرات کا سکوت اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان مغربی علمائے "نفیاتی اور ذاتی وحی کے لیے آپ کی تیاری اور دوسرے لوگوں سے مختلف معلومات لیکر انہیں وحی و الہام کا نام دینے کے جو من گھڑت قصے بیان کیے ہیں وہ سرتا پالغوا و رہے نبیاد ہیں۔"

اس سلسلہ میں ایک اور چیز بھی ذہن نشین رہے کہ جو لوگ چالاکی اور عیاری سے، ایک نئے بندے منصوبے کے تحت نبوت کا دعویٰ کرنے کے متمنی ہوتے ہیں ان کے دعوے میں کبھی بھی اتنا عزم اور یقین نہیں ہوتا جتنا کہ ایک سچے نبی کے دعوے میں ہوتا ہے۔ ایک سچے نبی کو نبوت ملنے سے پہلے اپنے مقام و مرتبہ کا کچھ علم نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنے منقلب کوئی دعویٰ نہیں کرتا لیکن جب اللہ تعالیٰ اسے اس امر کی اطلاع دے دیتا ہے کہ اُسے نبوت کے لیے منتخب کر لیا گیا ہے تو پھر وہ اپنے منقلب کسی کو لوگوں کی پالیسی کو اختیار نہیں کرتا۔ وہ پھر بر ملا لوگوں سے کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور میرے ماننے اور زمانے پر ایمان و کفر کا مدار ہے۔ جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ دائرہ اسلام میں داخل ہوگا اور جو میرا انکار کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ اعلان وہ بغیر کسی لاگ پریٹ کے کرتا ہے اور اپنے اس موقف سے ڈر کر بڑبڑھٹنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ ایک سچے نبی کے برعکس ایک متمنی کو اپنے مقام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر حالات سازگار ہوں تو وہ نبوت کا دعویٰ کر دیتا ہے اور انکار کرنے والوں کو کافر ٹھہراتا ہے لیکن جب حالات ذرا نا موافق دکھائی دیں تو فوراً اپنا موقف بدل دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے انبیاء علیہم السلام کے بارے میں لوگوں کے دو ہی موقف رہے، یا تو انہوں نے ان مقدس سستیوں پر ایمان لا کر اسلام کا قلاوہ اپنی گردنوں میں پہن لیا یا پھر انکار کر کے کفر کی راہ اختیار کی۔ کسی سچے نبی کے بارے میں لوگ کبھی ریب و تشکک میں مبتلا نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت، چونکہ باطنی قوتوں کا پرتو نہیں ہوتی بلکہ خداوند تعالیٰ کا عطیہ ہوتی ہے اس لیے نبی کو اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں پورا یقین و وثوق ہوتا ہے وہ نبوت کا دعویٰ حالات کی سازگاری یا ناسازگاری دیکھ کر نہیں کرتا بلکہ اللہ کے حکم کے مطابق دنیاوی مصلحتوں سے یکسر بے پروا ہو کر لوگوں سے کھلے بندوں کہتا ہے کہ میں نبی ہوں اور جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوگا اور جو میرا انکار کرے گا وہ جہنم کی آگ میں ٹھونک دیا جائے گا۔ اس ایک موقف کے علاوہ وہ کوئی دوسرا

موقف اختیار نہیں کرتا۔ وہ اس معاملے میں کسی مداخلت اور اخلاص سے کام نہیں لیتا۔ وہ اپنے دعوے کا آغاز اسی ایک چیز سے کرتا ہے اور اسی دعوے پر قائم رہتے ہوئے اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملتا ہے۔ اس دعوے میں کسی قسم کی تدریج نہیں ہوتی۔

اس کے برعکس اگر آپ ایک جھوٹے نبی کے دعویٰ کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس کا کذب فوراً معلوم ہو جائے گا۔ اس کے موقف میں کوئی ٹھہراؤ اور قرار نہیں ہوتا۔ وہ اپنے مرتبہ اور مقام کے بارے میں بھی ایسی ایسی چالیں چلانا ہے جیسے کہ وہ شطرنج کی بازی کھیل رہا ہے۔ پہلے ایک معمولی دعویٰ کر کے مخالفین کا ردِ عمل دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر حالات سازگار

مستقیم ہوئے تو پھر پہلے دعوے سے ذرا بلند دعویٰ کر کے لوگوں کے تاثرات کا اندازہ لگایا اور

اس طرح عقل و احساس کی گوبلیا دار لڑتے ہوئے اُن مقدس مقامات تک جا پہنچے جن کے بارے

میں مسلم قوم کے احساسات انتہائی نازک ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے خادمِ دین یٹھے اور دین

کو دوسرے ادیان پر غالب کرنے کا غلغلہ بلند کیا۔ جب لوگوں کی نظر میں اس کی شخصیت پر

بھٹنے لگیں تو پھر چپکے سے یہ کہہ دیا کہ میں محمد ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے براہِ راست پہلام

ہوتا ہے۔ جب عوام نے اسے بھی برداشت کر لیا تو پھر کہا میں علی نبی ہوں۔ اس پر جب لوگوں

نے سے سے شروع کی تو پھر قدم چھپے کی طرف لوٹاتے اور اپنے موقف سے ہٹ کر

عوام کو خاموش کرنے کی کوشش کی پھر حالات جب ذرا اپنے حق میں سازگار معلوم ہوئے

تو نبوت کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس دعوے پر کبھی بھی سختی کے ساتھ قائم نہ رہے۔ لوگوں کے

انکار و احساسات کے ساتھ ہمیشہ آنکھ مچولی کھیتے رہے اور عقیدت مندوں کے ذہنوں کو

تاویلات کے گورکھ دھندوں میں ایسا الجھایا کہ وہ پیچھے سے زندگی کے بعد بھی اس امر کا

فیصلہ نہ کر سکے کہ اس تدعیٰ کو کس زمرہ میں شامل کیا جائے۔

ایک سچائی چونکہ اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہدایت حاصل کرتا ہے اس لیے اُس کے

قلب و دماغ میں کسی قسم کا کوئی شک اور الجھاؤ نہیں ہوتا۔ اس کی ہر بات میں یقین اور وثوق سے

لبریز ہوتی ہے۔ حالات کی موافقت یا ناسازگاری اُس کے راستے میں بالکل حائل نہیں ہونے پاتی۔ وہ اپنے متعلق اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کیا ہے اور اسے کس منصب سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اس منصب کے بارے میں اُسے کس حد تک یقین حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ حضور کی حیاتِ طیبہ کے ایک ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ قریش مکہ نے جب تنگ آکر حضور کے چچا ابوطالب کے پاس آکر شکایت کی کہ آپ کا بھتیجا ہمارے معبودوں کو گالیوں دیتا ہے، ہمارے دین میں حیب نکالتا ہے اور ہمارے عقلمندوں کو بیوقوف بناتا ہے اور ہمارے بزرگوں کو گمراہ ٹھہراتا ہے۔ لہذا یا تو اب آپ اسے اس کام سے باز کیجئے یا ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اسے سختی سے روک دیں۔ ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب ہم زیادہ مدت تک اس صورت حال کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ابوطالب کفار مکہ کے اس چیلنج سے متاثر ہوتے اور کہا:

”اے میرے بھائی کے بیٹے! تمہاری قوم میرے پاس آئی ہے، اور اُس نے یہ

باتیں کہی ہیں۔ جو عام لوگوں نے (شکایتاً) اس کے پاس پہنچائی تھیں۔ مجھ پر اور پڑتی بات پر رحم کھاؤ اور مجھ پر ایک ایسا بوجھ نہ ڈالو جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا۔

چچا کی یہ بے بسی حضور کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل نہ پیدا کر سکی کیونکہ انہیں اللہ تعالیٰ کی دستگیری پر کامل اور مکمل بھروسہ تھا اس لیے انہوں نے پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ چچا کو

یا عمر، واللہ لو وضعوا الشمس فی عینی، والقمر فی لیاری علی ان اتروک
چچا جان، اللہ کی قسم اگر یہ لوگ میری دائیں جانب
سوزج اور بائیں جانب چاندھی رکھ دیں کہ میں اس
دعوت سے دستبردار ہو جاؤں، تو ایسا ہرگز نہیں
ہو سکتا۔ میں اس فرض کی بجا آوری میں اُس وقت
فیہ ما ترکتہ لہ

تک منہمک رہوں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ خود اس دعوت کو غالب کر دے یا میں اس تک و دو میں جان جان آخر میں کے حوالہ کر دوں۔

یہ ہے وہ حیرت انگیز شعور و ادراک جو نبی کو اپنے منصب اور موقع کے بارے میں ہوتا ہے اور یہ ہے وہ زیر دست و ثوق و اعتماد و مجرب صادق خدائے لم یزل پر رکھتا ہے! انبیاء علیہم السلام سے چونکہ خداوند تعالیٰ خود ہم کلام ہوتا ہے اس لیے ان کے دل و دماغ کے کسی گوشہ میں تذبذب کا کوئی شائبہ بھی پیدا نہیں ہونے پاتا۔

حنور کے اس فرمان سے، کہ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ دیے جائیں تو میں اپنی دعوت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جہاں ایک طرف حنور کے غیر معمولی عزم و استقلال کا اظہار ہوتا ہے وہاں اس میں ایک اور لطیف نکتے کی طرف نہایت بیگانہ انداز میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی مجھے اللہ تعالیٰ نے جن دلائل و براہین سے نوازا ہے وہ میرے نزدیک سورج اور چاند سے بھی زیادہ منور اور واضح ہیں۔ ان کے مقابلے میں شمس و قمر کا نور بالکل ماند ہے۔ براہین الہیہ سامنے آجانے کے بعد، اور خالق کائنات کے سورج اور چاند سے زیادہ روشن دلائل دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں محض خلق کی مخالفت کے خوف سے انہیں پس پشت ڈال دوں۔

حنور سرور عالم کو خداوند تعالیٰ کے ارشادات اور اس کے وعدوں پر کس حد تک بھروسہ تھا اس پر حنور کی پوری زندگی شاہد ہے۔ جب ہم حنور کی حیات طیبہ کے مختلف واقعات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہ ایک شخص کے سامنے سے غیب کے سارے حجابات دور کر دیئے گئے ہیں اور وہ ایک قادر مطلق خالق کی ذات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ رہا ہے۔ ایک منصور بھی ذات حق کے مشاہدہ کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اسے اس مشاہدہ پر اتنا وثوق و اعتماد نہیں ہوتا جتنا کہ ایک نبی کو حاصل ہوتا ہے! انبیاء علیہم السلام اور خالق کے درمیان پیغام رسانی کا جو سلسلہ قائم ہوتا ہے وہ چونکہ خود اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت اور نگرانی میں قائم کرتا ہے اس لیے اس میں نہ تو انبیاء علیہم السلام کی داخلی کیفیات اور قلبی ولرویت وخیلی ہونے پاتی ہیں اور نہ ہی ان کا ذاتی مشاہدہ اور مطالعہ وحی و الہام پر کسی طرح اثر انداز

ہوتا ہے خداوند تعالیٰ پر اس غیر معمولی وثوق و اعتماد کے واقعات سے سیرت کی ساری کتب بھری پڑی ہیں۔ ہم یہاں بطور مثال صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں۔

حضرت کی جان مسلمانوں کو کس حد تک عزیز تھی اُس کا اندازہ ہر وہ مسلمان کر سکتا ہے جس نے حضور اور اُن کے جان نثار صحابہ کے باہمی تعلق کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے۔ حضور کے رفقاء کار اُن کے دسوز قدائی تھے اور حضور کے معاملے میں ان کے احساسات اتنے نازک تھے کہ دشمنوں کے زورے میں گھر کر بھی جب ان سے یہ کہا جاتا کہ کیا تم اس بات کو گوارا کرتے ہو کہ تمہاری جگہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خون گرا دیا جائے تو انہوں نے غیر معمولی جرأت اور دسوزی کے ساتھ فرمایا کہ کہا کہ ظالمو! تم تو میری جان بخشی کے صلے میں حضور کے مقدس خون گرانے کے متعلق بات کر رہے ہو مجھے یہ بات تو گوارا ہے کہ دشمنوں میرا سرتن سے جدا کر دے اور وہ خاک و خون میں تڑپنے لگے، لیکن مجھے یہ بات کبھی گوارا نہیں ہو سکتی کہ میری جان کے بدلے حضور کے پائے مبارک میں ایک کانا بھی میچھ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور کی جان کی آپ کے صحابہ ہر وقت حفاظت اور ہمسائی کرتے رہے۔ چنانچہ سیرت کی کتب میں درج ہے کہ معرکہ بدر میں جب ایک رات حضور سرورِ دو عالم آرام فرما رہے تھے تو سعد بن معاذ نے چوکیداری کا فرض انجام دیا، احد کے دن محمد بن مسلمہ نے یہ خدمت انجام دی۔ خندق کے دن زبیر بن العوام نے حضور کے خیمہ کے گرد پیرہ دیا۔ ان اصحاب کے علاوہ ابن بشر اور بہت سے دوسرے خوش نصیب لوگ ایسے تھے جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ مگر جس وقت حضور پر یہ آیت نازل ہوئی: **وَاللّٰهُ يَعْصِيكَ** من الناس، یعنی اب اللہ خود تمہاری جان کی حفاظت کرے گا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور اپنے جان نثاروں کو اس کے متعلق مطلع کر دیا اور جو لوگ اس خدمت پر راضی تھے اُن سے کہا: اب آپ تشریف لے جائیں کیونکہ اللہ نے میری حفاظت کا خود ذمہ لے لیا ہے۔

خدا کے ارشاد پر یہ غیر معمولی یقین اور اعتقاد اسی شخص کے قلب و دماغ میں پیدا ہو سکتا ہے جس کا خداوند تعالیٰ سے براہ راست تعلق قائم ہو چکا ہو۔ جو مقدس ذات خداوند تعالیٰ کے وعدے پر اپنی جان کی حفاظت اور نگرانی اس کے ہاتھ میں براہ راست دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے اور اپنے خدمت گزاروں سے صاف طور پر کہہ دیتی ہے کہ وہ اب اس کے ایسے فکر مند نہ ہوں، اس کے متعلق غفلت یہ باور نہیں کر سکتی کہ وہ غلطی سے اپنے ذاتی احساسات کو الہامی کیفیات سمجھنے کی تاریخ کے اوراق نے اس امر کی شہادت بھی دی ہے کہ خداوند تعالیٰ کا دعویٰ پورا ہو کر رہا، اور اللہ کا رسول دشمنوں کے زرخے میں گھر کر بھی محفوظ و مامون رہا اور اس کی جان کی حفاظت اور پاسپاسی خود خالق کائنات نے کی۔ حضور کے خداوند تعالیٰ پر اس غیر معمولی اعتقاد و اعتراف بڑے بڑے منتصب مستشرقین تک نے کیا ہے :

”ہم خواہ اہیں نبی کہیں یا شاعر لیکن ہم ایک بات ضرور محسوس کرتے ہیں کہ جو الفاظ ان کی زبان فیض ترجمان سے آواہوتے وہ کسی عام انسان کے الفاظ نہیں ہو سکتے۔ یوں نظر آتا ہے کہ ان الفاظ کا تعلق اشیاء کی اصل حقیقت سے تھا اس کی وجہ سے کہ حضور کا دنیا کی سب سے بڑی حقیقت (یعنی ذات باری تعالیٰ) سے براہ راست تعلق قائم ہو چکا تھا۔“

ڈمار اندریؒ محمدؐ لندن ۱۹۳۶ء ص ۲۴۷

”ہ حضور خدا سے واحد کے رسول تھے، اور اپنے اس مرتبہ اور منصب کا شعور و ادراک انہیں زندگی کے ہر لمحہ حاصل رہا، یہ حقیقت کبھی بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائی۔ امد جو پیغام وہ خدا کی طرف سے لیکر دنیا میں تشریف لائے تھے وہ ہمیشہ ان کے سامنے رہا۔“ دین پوپل ڈی پرافٹ اینڈ اسلام ص ۳۹

(باقی)